دکنی مثنویوں کی نمایاں خصوصیات
(فنی، ادبی، تہذیبی، تاریخی وسماجی نقطۂ نظر سے)

ڈاکٹر سید تاج الہدا محمد یوسف خطیب
اسسٹنٹ پروفیسر وصدر شعبۂ اردو انجمن ڈگری کالج
بیلگاوی، کرناٹک

ملخص

اردو ادب کے ارتقاء اور نشو ونما میں فارسی ادب کے ساتھ ساتھ ہندوستانی تہذیب کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔ نیم مذہبی یا نیم تاریخی واقعات پر مبنی قصوں کی تفصیلات میں مقامی آب ورنگ کی شمولیت ایک فطری اور لازمی بات ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو مثنویوں میں ہندوستانی تہذیب کے عناصر جلوہ گر ہیں۔ ان مثنویوں میں ہندوستان کے مختلف موسموں کی رنگینیاں، مذہبی اور غیر مذہبی رسوم کی تفصیلات اور خالص مذہبی تلمیحات بکثرت ملتی ہیں اور اس مِلے جُلے کلچر کی بوقلموں کے اندر اس کی ترجمانی بھی پائی جاتی ہے جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے صدیوں تک ایک ساتھ رہنے سے عالم وجود میں آیا۔

دکنی مثنویوں کی بہت سی خصوصیات ایسی ہیں جو ان کو شمالی ہند کی عام شاعری اور عام مثنوی نگاری سے ممتاز کرتی ہیں۔ اوّل یہ کہ ان مثنویوں کی زبان جیسا کہ واضح ہے شمالی ہند کی مثنویوں کی زبان سے مختلف ہے ان میں دکن کے باقی ادب کی طرح مقامی الفاظ کی آمیزش بہت زیادہ ہے جس کی وجہ سے ان کی زبان بعض اوقات بالکل نامانوس بلکہ ناقابل فہم ہو جاتی ہے۔

دکن کی مثنویات کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دکن کا ادیب وشاعر زندگی کی عام اور خارجی اشیاء سے زیادہ اعتناء کرتا ہے۔ اسے مجردات اور حقائق سے زیادہ متحرا اور مادی چیزوں سے دلچسپی ہے۔

دکنی شاعروں کا واقعہ نگاری کی طرف خالص میلان ہے یہی وجہ ہے کہ انہوں نے بیانیہ نگاری کی اکثر اصناف نظم میں طبع آزمائی کی ہے۔ مرثیہ رزم نامہ، داستان گوئی، جنگ نامہ ان کی جولانی طبع کا خاصی میدان ہے اور ان موضوعات کے لئے مثنوی کا سانچہ ان کے لئے بطور خاص مرغوب ہے۔

☆☆☆☆☆

اردو میں حقیقی رزمیہ (ایپک) کا تقریباً فقدان ہے مگر بعض رزم نامے ایسے ہیں جن میں ایپک کی چند خصوصیات موجود ہیں۔ دکنی مثنویوں میں یہ رزم نامے شامل ہیں۔ سچے تاریخی جنگ ناموں اور رزم ناموں سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ یہاں کا شاعر اپنے گردوپیش سے بیزار نہ تھا بلکہ اسے اپنی سرزمین سے بے انتہا محبت تھی ۔شوقی کا فاتح نامہ وطنی حقیقت کا آئینہ دار ہے اور جنگ نامہ عالم علمی ماحول سے گہرے تعلق کا قوی ثبوت پیش کرتا ہے۔

عشقیہ مثنویوں میں بھی دکنی شعراء نے جنگ و پیکار کے مناظر دکھائے ہیں۔ جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان شاعروں کی زندگی کے ہنگاموں سے اچھا خاصا لگاؤ تھا۔

مجموعی لحاظ سے دکنی مثنوی کا تنوع قابل ذکر پہلو ہے جو بعد کی مثنوی میں ہمیں نہیں ملتا ۔اس میں پرانی داستانوں کے ترجمے بھی ہیں جن کو شاعروں نے نئے مذاق کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔ جنگ ناموں میں نصرتی کی مثنوی ''علی نامہ'' میں واقعات کا بیان عمدہ ہے۔ اگر چہ اردو کی کوئی مثنوی فنی ایپک کی حدود میں نہیں آئی مگر واقعہ نگاری اور بیان نگاری کے اچھے خاصے نمونے اس زمانے کی مثنویوں میں مل جاتے ہیں۔ فنی لحاظ سے مثنوی اس دور میں ارتقاء کی منزلیں طے کرتی رہی۔ فارسی مثنویوں کے نمونے اس کے سامنے تھے۔ جن سے پورا فائدہ ابتدا میں اٹھایا گیا اور بعد کی مثنویاں بھی ان سے یقیناً مستفید ہوئیں اگر ان مثنویوں میں جسم کے بے ڈھنگے پن بے ضرورت طول یا بے جا اختصار کا عیب نہ ہوتا تو ان میں سے شمالی ہندوستان کی صف اول کی بعض مثنویوں کا مقابلہ کر سکتی تھیں۔ ورنہ ربط، انتظام وقوام اور تسلسل اس کے علاوہ قصہ پن اور بیانیہ نگاری کی خوبیوں کے لحاظ سے انہیں اور شمالی ہند کی اکثر مثنویوں میں کوئی فرق نہیں۔ دکنی مثنویوں کا ایک رجحان ایسا ہے کہ جس کی شمالی ہند نے خاصی مدت تک تقلید کی۔ وہ ہے ذاتی رومان نگاری۔

ہندوستان کی یہ خصوصیات بیان کی جاتی ہے کہ یہاں بے شمار لوگ باہر سے آتے گئے اور مقامی خصوصیات میں رنگتے چلے گئے۔ ان مثنویوں میں بھی یہی خصوصیت صاف نظر آتی ہے کہ ایرانی شہزادے ہوں یا

پرستان کی پریاں، یہ سب ہندوستانی لباس پہنے ہوئے اور ہندوستان کے رسم ورواج کی روشنی میں نہائے ہوئے نظر آتے ہیں۔

اردو مثنویوں کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانے اور اردو زبان وادب کی تاریخ میں ان کا صحیح مقام متعین کرنے کے لئے تاریخی معاشرتی پس منظر کے ساتھ ان کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ اردو ادب نے فارسی ادب سے بہت کچھ استفادہ کیا۔ اس پر اسلامی، ایرانی روایات کے علاوہ ہندوستانی رنگ بھی غالب ہے۔ اس نے یہاں کے ماحول وفن طرزِ معاشرت اور تہذیب وتمدن کے گہرے اختلاط واشتراک کی نشان دہی کرتی ہیں۔ جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے میل جول کے بعد ہندوستان کی تہذیبی اور سماجی سطح پر اثر انداز رہا۔ قدیم مثنویوں میں اکثر و بیشتر کہانیاں اور قصے بیان کئے جاتے تھے۔ جن کا گہرا تعلق قومی روایت، مذہب اور معاشرت سے ہوتا تھا چونکہ اردو مثنوی مشترکہ تہذیب اور ملی جُلی معاشرت کے زیر اثر وجود میں آئی۔ لہٰذا اسلامی قصے اور داستانوں کے علاوہ ہندوستان کی لوک کتھائیں اور عوامی روایتیں وغیرہ عموماً اس کے موضوعات تھے۔

اردو زبان و ادب کا باقاعدہ فروغ و ارتقاء قطب شاہی اور عادل شاہی بادشاہوں کی زیر سرپرستی دسویں صدی ہجری میں شروع ہوا۔ اسی زمانے میں درباری شاعر ملا وجہی نے سلطان محمد قلی قطب شاہ کی واردات عشق کو مثنوی ''قطب مشتری'' میں شاعرانہ انداز میں پیش کیا۔ غواصی نے الف لیلیٰ کی کہانیوں پر مبنی ایک مثنوی ''سیف الملوک و بدیع الجمال'' لکھی۔ ملک الشعراء نصرتی نے ''گلشن عشق'' کے نام سے منوہر اور مدھومالتی کے مشہور قصے کو نظم کا جامہ پہنایا۔ ان کی مثنوی علی نامہ ایک رزمیہ مثنوی ہے۔ جس میں علی عادل شاہ، مغلوں اور شیواجی کی جنگوں کی داستان بیان کی گئی ہے۔

اس زمانے میں ابن نشاطی نے اپنی مشہور ومعروف مثنوی ''پھول بن'' لکھی۔ دکنی ادبیات کے اس دور میں اسلامی داستانوں کے علاوہ ہندوستانی لوک کہانیاں بھی بے حد مقبول رہیں۔ ایک طرف امین، دولت اور کیفی نے بہرام گور کے فارسی قصوں کو اردو زبان میں منتقل کیا۔ ملک خوشنود اور ہاشمی نے ''یوسف زلیخا'' اور احمد نے لیلیٰ مجنوں سے متعلق مثنویاں قلمبند کیں تو دوسری طرف غلام علی عشرتی اور محمد فیاضی ولی ویلوری نے گیارہویں اور بارہویں صدی ہجری میں اپنی اپنی مثنویوں میں پدماوت کی داستان عشق کو بیان کیا۔ مقیمی نے چندر بدن اور مہیار کے قصے کو نظم کا جامہ پہنا کر آنے والے شعراء کے لئے نئی راہوں کو کھول دیا۔ مقیمی کے بعد پانچ اور دکنی شعراء محمد باقر آگاہ، واقعہ، بلبل، شاکر، اور سیف اللہ نے بھی اسی داستان کو تختۂ مشق بنایا۔

مثنوی مغل اور ناگرنی، مثنوی نازنین و پٹھان، مثنوی ہیرالال، مثنوی نقوبائی، طالب وموہنی، شمع عشق اور بہلول صادق وغیرہ مثنویاں اسی دور میں ضبط تحریر میں لائی گئیں۔

۱۰۹۷ھ میں مغلوں نے بیجاپور کی سلطنت کا چراغ گل کر دیا۔ اس کی شکست و ریخت کا ذکر سید عالم بیجاپوری نے اپنی مثنوی ''جامع المعجزات'' میں بڑے درد و سوز کے ساتھ کیا ہے۔

۱۰۹۸ھ میں اورنگ زیب نے قطب شاہی سلطنت کو بھی مغلیہ سلطنت میں شامل کر لیا۔ بیجاپور اور گولکنڈے کی دونوں سلطنتوں سے وابستہ شعرا ویلور، اکاٹ کرنول اور کڑپہ وغیرہ مختلف ریاستوں میں منتشر ہو گئے۔ اس عالم انتشار میں مثنویاں تحریر کی گئیں ان سے بھی دکنی شاعروں کے ہندوستانی موضوعات سے دلچسپی وابستگی کے رجحان کا پتہ چلتا ہے۔ اندر سبھا کی طرز پر عارف الدین عاجز نے ۱۱۲۶ھ سے کچھ قبل مثنوی قصہ لعل و گوہر قلمبند کی اور سید احمد ہنر نے ابن نشاطی کے پھول بن کے جواب میں ۱۱۴۴ھ میں مثنوی ''نیا در پن'' تصنیف کی۔ جس میں راجہ راج کنور اور رانی کام لتا کا قصہ درج ہے۔

مقامی موضوعات پر طبع آزمائی کا یہ رجحان بارہویں صدی کے دکنی شعرا کے یہاں بھی ملتا ہے۔ اس زمانے میں طوطی نامہ سے ملتی جلتی تین اور مثنویاں گجرات میں لکھی گئیں۔ مثنوی سوداگر کی بی بی از سید عبداللہ، طوطا مینا از روشن علی اور مثنوی روشن سوداگر از جمال الدین نین الدین کی مثنوی کام روپ اور کلا کام دکنی زبان ہی میں ۱۱۷۰ھ میں لکھی گئی۔

دکنی ادب کو جب ہم تمدنی لحاظ سے دیکھتے ہیں تو شدت سے محسوس ہوتا ہے کہ ابتدائی دور میں وہ بہت زیادہ مذہبی عقائد پر مبنی ہے۔ کم حصہ ایسا ہے جس میں براہ راست تصوف اور اللہ و رسول ﷺ کی باتیں آ گئی ہیں اور کچھ ایسا بھی ہے جس میں بزرگانِ دین کی منقبت یا ان کی تاریخی لڑائیوں شجاعت، مصائب اور دیگر کارناموں کو شعراء نے اپنے طور پر نظم کرنے کی کوشش کی ہے چونکہ زیادہ تر اس ادب کی شاعری میں صوفیائے کرام کا ہاتھ رہا ہے۔ اس لئے عموماً اس میں کسی فرقہ یا شخص کی دل آزاری سے زبان آلودہ نہیں ہوئی بلکہ وسیع النظری اور اختلافات میں احتیاط کی جستجو نے ہندو بزرگان اور دیو مالا کا بھی تذکرہ بڑی عقیدت مندی سے پیش کر دیا ہے۔ غیر مذہبی اور ادبی ذخیرہ میں عشقیہ داستانیں، بادشاہوں کی سرگذشت، ان کی شادیوں کے تذکرے اس وقت کی دکنی تہذیب و مذاق کا پرتو سبھی کچھ آ گیا۔ دکن کی زبان کے مواد کا مطالعہ ہم کو اس نتیجہ پر پہنچاتا ہے کہ جیسے جیسے ادب میں جان اور تمدن میں یکسانیت اور شعور میں پختگی آتی گئی۔ شاعر میں بھی رنگا رنگی زیادہ ہوتی گئی۔ مذہب کے علاوہ زندگی کے دوسرے مسائل اور انسان کے مختلف جذبات بھی شعراء نے اپنی شاعری میں سمیٹنے کی فکر میں نتیجہ یہ ہوا کہ ادب میں تنوع روز بروز زیادہ ہوتا گیا۔

دکنی معاشرہ کی ذہنی نشو و نما جس کو ہم بیان کر چکے ہیں وہی سارا سامان نشاط و آراستگی شعراء کے خیالات و شاعری کا مواد بن جاتا ہے۔ رسم و رواج، تہوار ان کے شعری محرکات کی بنیاد ہو جاتے ہیں۔ حسن و عشق کی

داستانیں جو وہ دیکھتے ہیں وہ ان کی طبع رسائی غذا قرار پائی ہیں۔ گویا ان میں شاعری کی خمیر میں وہ مذاقِ معاشرہ شامل ہے جو تمدنی فضاء کا پروردہ ہے اور یہی مذاق ان کی فکر رسا کو اتنا متاثر کرتا ہے کہ اپنے طور پر اس کو قلمبند کرنے پر وہ اپنے آپ کو مجبور پاتے ہیں۔ فنی و ادبی، سماجی و تہذیبی نقطۂ نظر سے اس ضمن میں چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

مثنوی کدم راؤ پدم راؤ فنی و ادبی لحاظ سے اردو زبان کا قدیم ترین ادبی و لسانی نمونہ ہے۔ جسے بہمنی دور حکومت میں فخر الدین نظامی نے تصنیف کیا۔ یہ مثنوی اردو زبان کی پہلی روایت کا نمائندہ ہے جس کا ذخیرہ الفاظ ،اسلوب، لہجہ آج کی زندہ اور بولی جانے والی زبان سے مختلف ہے۔ لیکن اس کا مقابلہ آج کی اس زبان سے کریں جو ہندوستان کی ادبی کتابوں میں نظر آتی ہے اور جسے ''ہندی'' کا نام دیا جاتا ہے اور جس میں سنسکرت کے بہت کم الفاظ دوبارہ زندہ کئے جا رہے ہیں تو اس کا اسلوب جدید ہندی اسلوب سے مشابہ نظر آتا ہے لیکن سوائے اس کے اس کی زبان وہی ہے جو آج ہم بولتے ہیں اور جسے اردو کے نام سے پکارتے ہیں۔ مثلاً جب ہم یہ اشعار پڑھتے ہیں تو ہمیں یہ احساس نہیں ہوتا ہو کہ ہم کسی بالکل مختلف زبان کا مطالعہ کر رہے ہیں۔

کدم راؤ کہیا پدم راؤ سُن کہیا — کہ جسے ساچ مانے کہوں آپ گُن
نہ اگلا سنبالے کے پچھلا کہاں — نہ پچھلا س نبھالے کہ اگلا کہاں
کہ جسے بول میرا کے تس کہوں — کہ مے نہ سُنے تِل کھڑی نہ رہوں
کہیا راؤ سن دشٹہ پر دھان بول — اٹھیا گرج یوں جیوں اُٹھے گرج ڈھول

مثنوی ''کدم راؤ پدم راؤ'' میں روزمرہ محاوروں کا استعمال کثرت سے ہوا ہے جس سے زبان کے ارتقاء کا اندازہ آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔ یہ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

ٹھکائی کرنا۔ — کہیں بیس چھجے دلوں بار جگ
ٹھکائیں کروں جو کرے جگ تھگ

سب کو ایک لکڑی سے ہانکنا۔ — نہ سر پار کروؤ دکوں ہیں ساک
سبھی استریاں ایک لکڑی نہ ہانک

پھول پھل ہونا۔ — بھلا دیکھ سُنبل بڑا دیکھ چھانٹ
کہ پھر پھول پھل ہوئے تھی کانٹ کانٹ

آنکھ پھوڑنا۔ — جو بھر آنکھ دیکھے کہوں آنکھ پھوڑ

ناک کاٹنا۔ — بتولی دیا پونچھتے کاٹ ناک

ناک اونچی کرنا۔ — جناں ناک اونچی کرے باؤبل

اس قسم کے سینکڑوں روزمرہ محاورات کے موتی پوری مثنوی میں بکھرے پڑے ہیں۔ یہی صورت ضرب الامثال اور کہاوتوں کی ہے۔ کچھ کہاوتیں ایسی ہیں جو فارسی سے ترجمہ ہو کر عام ہو گئی ہیں اور کچھ کہاوتیں ایسی ہیں جو صدیوں سے سینہ بہ سینہ چل کر ہم تک پہنچی ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہو۔

۱) آج کا کام کل پر مت چھوڑ ۔ جو کچ کال کرنا سو آج کر
نہ کھال آج کا کام توں کال پر

۲) ایک در بند ستر در کھلے ۔ سنیا ہے کہ کرتار جس وہیہ جس
نے دوار بند ایک دے کھول دس

۳) مٹی میں ہاتھ ڈالے تو سونا بن جائے۔ جسے دہیہ سر بھاگ تو نس سرے
جو ماٹی پکڑ ہت سنا کرے

اردو شاعری کے متعلق یہ عام خیال ہے کہ اس میں نیچرل امور کی ترجمانی اور فطری عنوانوں پر آرائی مغربی شاعری کے اثر سے ہوئی ہے اور یہ مغربی مضراب ہی کا ایک سُر ہے جو اردو شاعری کے بربط سے نکل رہا ہے۔ اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ اردو کی جدید شاعری کے متعلق یہ بات صحیح نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ دکنی میں نیچرل شاعری کا وجود اس وقت سے ہے جبکہ مغربی شاعری سے کوئی واقف بھی نہیں تھا۔ اور نہ ہندوستان میں مغربی شاعری کے اثرات ہی شروع ہوئے تھے۔

نیچرل شاعری کیا ہے؟

مولانا حالیؔ ''مقدمۂ شعروشاعری'' میں اس کی وضاحت یوں کرتے ہیں۔

> ''نیچرل شاعری سے مراد وہ شاعری ہے جو لفظ اور دنیا دونوں حیثیتوں سے نیچرل یعنی فطرت اور عادت کے عین موافق ہو۔ لفظ نیچرل ہونے سے یہ غرض ہے کہ شعر کے الفاظ اور ان کی ترکیب و بندش تابمند وراس زبان کی معمولی بول چال کے موافق ہے۔ جس میں وہ شعر کہا گیا ہے معناً نیچرل ہونے سے یہ مطلب ہے کہ شعر میں ایسی باتیں بیان کی جائیں کہ ہمیشہ دنیا میں ہوا کرتی ہیں یا ہونی چاہیے۔''

دکن کی مثنویاں چند ایسی سماجی، تہذیبی و تاریخی خصوصیات کی حامل ہیں جن کی بنا پر ہم ان کو زندگی کا

آئینہ کہہ سکتے ہیں۔

انسان مدنی الفطرت واقع ہوا ہے۔ وہ کبھی تنہا رہنا پسند نہیں کرتا بلکہ سماج میں رہنا، بسنا، بولنا اور جینا مرنا پسند کرتا ہے۔ اس معاشرتی زندگی کے ماتحت اس کو اپنے خیالات و جذبات کا اظہار بھی پسند ہے اور جب ان خیالات ونظریات اور تجربات کے اظہار میں فکر وفن کا رنگ بھی شامل ہو جائے تو اس میں اول شان پیدا ہو جاتی ہے۔ عام طور پر ادب وہی کہا جاتا ہے جس میں بقول ڈاکٹر سلام سندیلوی۔۔۔

> ''انسان کے دل کی دھڑکنیں بند ہوں۔ جس کے ماحول میں ایک چلتا پھرتا انسان سانس لیتا ہوا نظر آئے اور جس کی فضاء میں انسانوں کے قہقہے اور سسکیاں دونوں سنائی دیں۔ مختصر یہ کہ ادب کو زندگی کا آئینہ دار ہونا چاہیے۔''

ایک کامیاب مثنوی وہی ہوگی جس میں زندگی کی پرچھائیاں موجود ہوں۔ جس میں مثنوی نگار عشق و عاشقی اور ہجر و وصال کے دائرے تک محدود نہ رہتے ہوئے اسی طلسم سے ہٹ کر زندگی کی تلخ حقیقت کو محسوس کرے اور ان روزمرہ پیش آنے والے حقائق، حادثوں، منظروں رسم ورواج، تقریبات وغیرہ کو یوں پیش کرے کہ قاری خود کو اس آب وگل کی جیتی جاگتی اور چلتی پھرتی دنیا کا ایک فرد سمجھنے لگے۔

نصرتی کی مثنوی ''گلشن عشق'' قدیم اردو مثنویوں میں بلند مرتبہ کی مالک ہے۔ اس میں ویسے تو کنور منوہر اور مدمالتی کی داستان عشق نظم کی گئی ہے۔ لیکن حقیقت میں یہ مثنوی دکن کی تہذیب ومعاشرت کا ایک بے حد تفصیلی مرقع ہے۔ اس کے مطالعہ سے قدیم دکن کی معاشرتی زندگی کے تقریباً تمام پہلو بڑی جامعیت کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔ کہانی کے ضمن میں جگہ جگہ دکن کے رسم ورواج، زیورات، شادی بیاہ کی تقریبات، لوازمات، پھولوں، جانوروں، پرندوں اور شاہی آداب کا ذکر اس قدر آیا ہے کہ ایک جیتی جاگتی تہذیب اور اس کی سرگرمیوں کا نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔

شاہی تہذیب وتمدن کا نقشہ ملاحظہ ہو۔

> ''نصرتی عادل شاہی عہد کی شہنشاہ ہیت کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ بادشاہ خود شہر میں گشت کرتا اور رعایا کے دکھ درد سنتا اور ان کی مشکلوں اور تکلیفوں کو دور کرتا تھا۔ رعایا اور حکمران میں کوئی نمایاں فرق

نہیں ہوتا تھا۔ایک دوسرے کے دکھ درد کو آپس میں بانٹ لیتے تھے
مندرجہ ذیل اشعار سے یہ بات واضح ہوتی ہے۔

تو اس وقت وہ شاہ عالی مقام
شہر بیچ آسب کے لیوے سلام

نباڑے اپس مکھ سوں ہر تن کے نیاؤ
بندے خلق مرہم سوں ہردل کے کھاؤ

سرب بادشاہی کی لیوے خبر
دھرے پیار اوک نت رعیت اوپر

جتے بھی بڑیاں کوں کرے سرفراز
نوازے جسے پائے صاحب نیاز

''گلشن عشق'' میں کئی رسومات اور رواجوں کا بھی ذکر ملتا ہے۔جن میں سے چند یہ ہیں۔مثلاً اس زمانے میں لوگ بانجھ کے گھر کا پانی تک پینا گوارہ نہیں کرتے تھے اور اسے حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔شادی بیاہ اور دوسرے رسم و رواج میں اسے حصہ لینے سے منع کیا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ اس کے گھر سے کچھ لینا بھی مناسب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ملاحظہ ہو۔

کہ چل بیگ دو چام چرن پر تے سیر
روانیں جو لیوں بانج کے کھر تے نیر

بچن سن پوشہ گھر منے پھیر کر
خجل ہو چلیا جیو کوں دل گیر کر

کھانے کے بعد پان دینا صرف رواج نہیں تھا۔مہمانوں کی عزت کا باعث سمجھا جاتا تھا۔آج بھی یہ

رواج موجود ہے۔ ملاحظہ ہو۔

اگھانا ہوا خلق جب کھا کے پان
دھلا ہاتھ دے مان کے سب کو پان

اس طرح کئی زیوروں کا بھی ذکر آیا ہے جو دکن کے علاقوں میں ابھی مروج ہیں۔ بقول ڈاکٹر فہمیدہ بیگم۔ ''گلشن عشق'، عادل شاہی عہد کی بیجاپوری تہذیب وتمدن، رہن سہن اور وضع قطع کی بہترین عکاسی ہے۔ مثنوی میں کئی ایسے زیوروں کے نام آتے ہیں جو آج بھی کئی علاقوں میں مستعمل ہیں۔ مثلاً
کڑے، پنجن، چوڑ، گوٹھان، کنگن جو بیاہ کے موقع پر دلہن کو ضرور پہنائے جاتے ہیں۔ جھمکے، کرن پھول، نتھ کا رواج، قریوں میں آج بھی برابر جاری ہے۔ ہانس یعنی ہنسلی آج بھی مہدویہ عورت کے گلے کی زینت ہے۔''
شعر ملاحظہ ہو۔

ثریا ہوئی چور جھمکیاں کی عین
کرن پھول کے دپ رہے فرقدیں
ٹیلا قطب پڑنے میں کیتا سوہل
جھڑیا نتھ کا موتی جھلکتا سہیل
نکل ہانسی جایوں دسنی آیا گلا
جداچانہ سوں ہو رھیا جیوں کھلا

دکنی مثنوی میں جو رزمیہ نظمیں ہیں وہ تو گویا متعلقہ عہد کی ایک منظوم تاریخ ہیں ان رزمیہ مثنویوں میں جنگ کے واقعات کو صحیح ترتیب کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ کہیں دہشت کا ماحول ہے تو لفظوں میں سپاہیوں کی شجاعت بولتی ہے۔ تلواروں کی چمک دمک، حوصلہ بڑھاتے ہوئے نعرے، گرتے مرتے فوجیوں کی بے بسی اور فتح یاب فوج کا جوش اور فاتح بادشاہ کی فراخ دلی یہ سارے جذبات حقیقی اشکال میں دکھائے گئے ہیں۔ اس سلسلے میں نصرتی کا ''علی نامہ'' اور رستمی کا ''خاور نامہ'' خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ نصرتی نے جس سلیقے، صداقت پسندی اور دیدہ وری کے ساتھ واقعات نبرد کو پیش کیا ہے اس سے اس کے فن کی پختگی، زبان پر قدرت اور زور بیان کا بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے۔ ملا نصرتی کے ''علی نامہ'' کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر عبدالحق فرماتے ہیں۔

''نصرتی کا بڑا کمال یہ ہے کہ اس نے تاریخی واقعات کو صحیح ترتیب اور

بڑے احتیاط اور صحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ حسن بیان اور زور کلام
کے تمام اسلوب ہوتے ہوئے کہیں تاریخی صحت سے تجاوز نہیں کیا۔
تاریخ سے واقعات کو ملا لیجئے کہیں فرق نہ پائے گا بلکہ بعض باتیں شاید
ایسی ملیں گی جن کے بیان سے تاریخ تار ہے۔''

نصرتی اپنی مثنوی ''علی نامہ'' میں ایک جگہ ایسے منظر کی تصویر کشی کرتا ہے جس میں دکھنیوں اور مغلوں کے ایک معرکہ آرائی کا ذکر ہے۔ ملاحظہ ہو۔

اسی رات ارسطو دوراں کے یہاں — دکھن کے سیہ اعیان تھے مہماں
سنوارے تھے کئی انجمن دلنشیں — نشیمن میں پر روح راحت گزیں
بد اندیش کے دل کا جب بھید پائے — سبھی شیر مرداں نے غصہ میں آئے
کریں تیغ سوں پیش دستی ہمن — ناریں اونن سر ہے مستی ہمن
دلیراں اٹھے بولتے دہن دیں — کہے مالداراں کہ ہے زین زین

ابن نشاطی کی مثنوی ''پھول بن'' دکنی ادب کا ایک یادگار رہ کارنامہ ہے۔ اس میں دکنی معاشرت قطب شاہی عہد کی تہذیب اور مجلس، زندگی کے بڑے دلکش مرقعے موجود ہیں۔ دراصل ابن نشاطی نے جس تہذیبی فضاء کو پیش کیا ہے وہ نہ خالص ہندوستانی ہے اور نہ تمام تر ایرانی۔ ابن نشاطی قطب شاہوں کے پایہ تخت گولکنڈے کا رہنے والا تھا۔ سلطان عبداللہ قطب شاہ کے دور حکومت میں ابن نشاطی اس تہذیب کو پروان چڑھتے دیکھا تھا جو ایک علیحدہ اکائی ہوتے ہوئے بھی بنیادی طور پر ہندی سبھیتا اور ایرانی تہذیب کا حسین امتزاج تھی۔ عمارتوں کی تعمیر، رہن سہن کے طریقے، لباس، زیورات، عورتوں کے سنگھار کے طریقے اور سامان، باغات اور دریاؤں کے نقشے اس بات کی غماز ہیں کہ قطب شاہوں نے جس تہذیب کو معراج کمال پر پہنچایا تھا وہ ہندوستانی بنیادوں پر استوار ہوئی تھی۔

ابن نشاطی کی وطن پرستی اور ابنائے وطن سے وابستگی اس کی مثنوی میں جگہ جگہ دکھائی دیتی ہے۔ وہ ہندوستانیوں کی بہادری، ان کی حق پرستی اور جانبازی کی دل کھول کر داد دیتا ہے۔ وہ اپنے ہم وطنوں کی اس طرح ستائش کرتا ہے۔ دکنی ادب میں یوں تو یعنی اور مثنویوں کے قصے ہندوستانی ماحول سے ماخوذ ہیں اور ان میں عمومی روایات کو پیش کیا گیا ہے۔ لیکن ابن نشاطی کی ''پھول بن'' اس لئے امتیازی شان رکھتی ہے کہ اس میں شاعر نے ایک ایسا قصہ پیش کیا ہے جو ہند ایرانی معاشرے کے ذوق و احساس کو آسودہ کر سکے ہندوؤں اور مسلمانوں کے اشتراک سے جو مخلوط معاشرت ظہور پذیر ہوئی تھی اس کو ابن نشاطی نے بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ ''پھول بن'' میں

پیش کیا ہے۔

ابن نشاطی کی وطن پرستی اور ابنائے وطن سے وابستگی اس کی مثنوی میں جگہ جگہ دکھائی دیتی ہے۔ وہ ہندوستانیوں کی بہادری، ان کی حق پرستی اور جانبازی کی دل کھول کر داد دیتا ہے۔ وہ اپنے ہم وطنوں کی اس طرح ستائش کرتا ہے۔

ہیں ہندی اگر جھگڑے پر آویں گھڑی میں مار مصریوں کوں بھگادیں
ہمارا فن ہے کرنا ترک تازی ہمارا کام ہے شمشیر بازی
ہمارے راویاں کرتے ہتیاراں ہمارے راونان و شمن شکاراں
دلیری میں یوں ایسے ہیں دلیراں انن کوں دیکھا جنگل پکڑے شیراں
دلیری دیک ہر یک لشکری کی کمر بیٹھی ہے دھاکاسوں پر ٹیک کی
ہمارے لشکر اور ایسے ہیں جنگل پلنگ ان کنے سکنے پلنگی

شوقی نے سلطان محمد عادل کی شادی کے موقع پر جو مثنوی ''میزبانی نامہ'' کے نام سے لکھی تھی۔ اس میں وحدت کا اہتمام، جشن کی رنگارنگی، شادی کی دھوم دھام، محلات کی سجاوٹ، آتش بازی کی گرمی، باجوں کا شور وغیرہ اس خوبی سے نظم کئے گئے ہیں کہ اس عہد کے تہذیبی اور سماجی حالات کی عکاسی ملتی ہے۔ شوقی نے محمد شاہ کی میزبانی اور سلطان کی شہر گشتی کی تفصیلات نہایت ہی مسورانہ انداز میں قلمبند کیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

سداوار پرتجہ طبل ناچتے طبل باجتے ہور مندل کاجئے
بہت دیس نے شہ کی گھر کاج ہے شہر گشت کی رات سو آج ہے
شہر گشت کا ساز و سامان ہوا نفریاں ترائے و ماماں ہوا

دکنی شاعری کے ابتدائی دور میں نظم گو شعراء کی تعداد زیادہ نہیں ہے مگر مثنوی گو شعراء کافی تعداد میں نظر آتے ہیں۔ ان شعراء کی مثنویوں میں فنی، ادبی، سماجی، تہذیبی، تاریخی نقطہ نظر سے ایک منظر نگاری کے نمونے موجود ہیں۔

قدیم اردو میں مثنوی نویسی کی ابتداء مذہبی ناصحانہ اور صوفیانہ نظموں سے ہوئی۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ اس رنگ کی مثنویوں میں منظر نگار کے دلکش مرقعے نہیں ملتے۔ لیکن غور سے مطالعہ کیا جائے تو مذہبی مثنویوں میں بھی منظر نگاری کے دلکش مرقعے جگہ جگہ دکھائی دیتے ہیں۔

مثنوی ''پنچھی باچھا'' ۱۱۴۱ھ میں تصوف کے موضوع پر لکھی گئی ہے۔ یہ مثنوی طبع زاد نہیں ہے بلکہ وجدی نے شیخ فریدالدین عطار کی مثنوی ''منطق الطیر'' کا دکنی میں ترجمہ کیا ہے۔ اس مثنوی کا وصف یہ ہے کہ

مختلف پرندوں کی زبان اور حکایات میں تصوف کا مسئلہ وحدت الوجود کو بیان کیا گیا ہے۔ سارے پرندے ہُدہُد کی رہبری میں طلب، عشق، معرفت، استغنا، توحید حیرت اور رخنا کی سات وادیوں سے گذر کر سمرغ کی بارگاہ میں پہنچتے ہیں۔ یعنی سیمرغ خدا کی ذات اقدس ہے۔ اس مثنوی میں پرندے آپس میں گفتگو کرتے ہیں۔ مجلس آرائیاں ہوتی ہیں۔ ان کی فکر جستجو اور حیرت کے جذبات سے طرح طرح کے منظر بنتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر سلام سندیلوی۔

''وجدی نے فطرت کے ذریعہ متصوفانہ مسائل کا تجزیہ کیا ہے۔''

اس مثنوی کا انداز بالکل رمزیہ ہے۔ پرندوں کے قلب و ذہن میں چھپی ہوئی جستجو کی خواہش اور گھبراہٹ کی ترجمانی کے لئے وجدی نے نہایت دلچسپ موزوں تشبیہات اور استعاروں کا سہارا لیا ہے اور مختلف زاویوں کی خصوصیات کی تصویر کشی بھی بہت دلچسپ انداز میں کی ہے۔

مذہبی مثنویوں کا اگر ہم غور سے مطالعہ کریں گے تو ایسے کئی نمونے مل سکتے ہیں مگر ادبی اور داستانی مثنویوں میں ان نقوش اور خاکوں کا تنوع اور دلآویزی بہت زیادہ ہے بلکہ اسی وصف سے ان مثنویوں کو حیات جاوداں ملی ہے۔ جس سے لوگ مکمل ذہنی آسودگی حاصل کرتے ہیں۔

غزل ہو یا قصیدہ مثنوی ہو یا کوئی دوسری صنف یہاں تک کہ مرثیہ جس کی بنیادیں مذہبی روایات پر قائم ہیں وہاں بھی ہندوستانی روایات موجود ہیں اور مثنوی تو ہندوستانی فضا میں اور تمدن کا ایک بہترین مرقع ہے۔ وہ صرف اس لئے کی ہر ملک کے ادب پر وہاں کے جغرافیائی، مذہبی، تاریخی اور سماجی حالات اثر انداز ہوا کرتے ہیں۔ مثنویوں میں ہندوستانی سماج کی روایت کا تو یہ عالم ہے کہ پیدائش سے لے کر موت تک کے وہ رسومات ملیں گے جو خاصی ہندوستانی ہیں۔ چھٹی، چھلے، زچہ کا نہان، اس موقع کی تقریبات، راگ اور گیت، ڈھولک اور باجے، دستور وغیرہ سب کچھ ملے گا۔ یہ بات ضرور ہے کہ مثنوی نگاروں مثلاً نصرتی، وجہی وغیرہ کا تعلق درباری زندگی سے رہا ہے اس لئے رسومات وغیرہ شاہانہ اور راجگانہ طور کے نظم ہوئے ہیں اور عوامی زندگی سامنے نہیں آنے پاتی۔ اگرچہ خادموں، خواصوں، کنیزوں وغیرہ کا ذکر بہت آتا ہے۔ عوامی زندگی کی ایسی تصویریں نہ ہونے کی کمی مسلمانوں کے لوک گیت پوری کر دیتے ہیں۔

جب ہم دکن کے تہوار جشن اور رسم و رواج پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں شمالی ہند کے مقابلے میں دکن میں بعض تہواروں میں دلچسپی، انہماک اور جوش اور خروش کچھ زیادہ دکھائی دیتا ہے۔ قطب شاہی خاندان کے حکمران شیعہ مسلک کے پیرو تھے۔ شعیوں کو محرم سے روحانی شغف ہوتا ہے۔ قطب شاہی حکمران سے پہلے بھی دکن میں

محرم کے دس واقعات کربلا کے ذکر لیے واقف ہوتے تھے۔ادبی لحاظ سے اس تاریخی حادثے نے اردو کو مرثیہ جیسی ایک بے مثال صنف عطا کی ہے جو دکن سے نشو ونما پا کر دہلی کے شعراء کے ہاتھ پھولی اور لکھنؤ میں آکر میر انیس، مرزا دبیر کی مساعی جمیلہ سے ادب کی انتہائی منزل پر پہنچی۔

قطب شاہی خاندان نے محرم کو اتنا فروغ بخشا کہ وہ خواص اور عوام دونوں کی وابستگی کا ذریعہ خاص بن گیا۔ان بادشاہوں نے ان میں کچھ ایسی باتوں کا اضافہ کر دیا جو ماتم کے علاوہ دیدہ ودل کے لئے تفریح کا باعث بن گئیں۔علم پر صناعی، بچوں پر مرصع کاری، امام باڑوں کا حسن تعمیراتی اور چراغاں کا اہتمام یہ سب خصوصیات، روحانی جذبے سے سرشار حضرات کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے کافی تھیں۔وہ اسی رونق اور فنکاری سے متاثر ہو کر محرم منانے میں شرکت ضروری تصور کرتے تھے۔اس کی تفصیلات تاریخ مدیقیہ السلاطین میں درج ہیں۔اسی طرح عید میلا دالنبی ﷺ ایک ایسی تقریب ہے جو جشن خاصی اور دعوت عام کا پیام لیکر آتی ہے۔محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں اس اہم موقع کو زیادہ سے زیادہ توجہ حاصل ہوئی۔جشن عید میلا دالنبی ﷺ دادمحل کے میدان میں منایا جاتا جس کے تین طرف جواہر ونقاشی کی دکانیں ہوتیں اور گردوپیش کی عمارتوں کو خوب آراستہ وپیراستہ کیا جاتا۔اس جشن کی آمد سے پہلے ہی فنکار، صناع اور بازیگر وغیرہ اپنے کمالات کا مظاہرہ شروع کر دیتے تھے۔آس پاس کے دیہات سے لوگ اسے دیکھنے آتے۔اس کے علاوہ اور بھی عیدیں منائی جاتیں مگر کسی عید میں اتنا اہتمام نہ ہوتا۔ البتہ ناچ گانا اور چراغاں سب ہی عیدوں کا نمایاں پہلو تھا۔شب برات میں بیگمات آتش بازی میں شریک ہوتیں۔ اپنے ہاتھوں سے پٹاخیں چھوڑتیں سلطان قلی قطب شاہ نے اپنی مخصوص نظموں میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔ہر عید کے موقع پر قطب شاہ رنگ رلیوں کا انتظام کرتا اور ساتھ میں ادبی سرگرمی سے جشن کی محفلوں کی رونق دوبالا کرتا۔ چنانچہ وہ اپنی شاعری سے کسی تہوار کو محروم نہ رکھتا خود نظمیں کہتا۔جن سے اہل محفل لطف اندوز ہوتے۔برسات کی آمد کا استقبال جشن شاہانہ سے کرنا خود قلی قطب شاہ کی ندرت پسندی کا نتیجہ تھا۔اس پُر بہار موقع کو اس نے ایک عوامی تہوار بنا کر ہندوستان کے بہترین موسم کے رومانی فضاء سے لطف اندوز ہونے پر سب کو مائل کیا۔

سیاسی، سماجی اور علمی شعور میں جیسے جیسے پختگی آتی گئی دکن میں شاعری کو بھی فرصت نگاہ ملتی گئی۔زندگی کے بہت سے پہلوؤں پر تفصیلی بیانات شاعرانہ انداز میں سامنے آتے گئے۔مختصر یہ کہ مثنوی نگاروں نے قدرت کی ہر چیز سے محبت کی ہے اور قدرتی ماحول ہر لمحہ ان کے پیش نظر رہا ہے۔

ایک فیروز، محمود، نظامی، مقیمی، صنعتی، وجہی، غواصی، طبعی، دولت، عاجز، ابن نشاطی اور نصرتی تو کیا دکن کا ہر شاعر مثنوی نگار تھا اور ان شاعروں کے ساتھ ساتھ بادشاہوں میں ابراہیم عادل شاہ، علی عادل شاہ ثانی، عبداللہ قطب شاہ اور قلی قطب شاہ وغیرہ کی تمام مثنویوں اور نظموں کا احاطہ تو یہاں ممکن نہیں ہے لیکن مندرجہ بالا ذکر کی گئی

مثنویوں کے نمونوں سے دکنی مثنویوں کی خصوصیات پر مستقل روشنی پڑتی ہے۔

ان تمام باتوں کے بعد جب ہم دکنی مثنویوں کے مواد و محرکات کی جستجو کرتے ہیں تو یقین کرنا پڑتا ہے کہ خیالات اور جذبات کو شعر کا جامہ پہنانے میں اس وقت کے سماجی، تہذیبی اور تاریخی اور اس وقت کا تمدن شاعری کا سب سے بڑا مواد تھا۔